پروفیسر محمدؐ عثمان

نظامِ مملکت کے متعلق قرآن کی حکیمانہ روش

اسلام میں دین و سیاست ایک ہیں بھی اور نہیں بھی۔ جہاں تک روحِ دین کا تعلق ہے مسلمانوں کی سیاست اس سے الگ نہیں رہ سکتی مگر جہاں تک ایک جدید سوسائٹی کے آئین و انتظام کی جزئیات کا تعلق ہے اگر ہم انہیں قرآن و سنت میں ڈھونڈنے کی کوشش کریں تو یہ کوشش بے سود بھی ہوگی اور غیر مستحسن بھی۔ قرآن حکیم نے انفرادی اور اجتماعی زندگی کے چند موٹے موٹے قاعدے بتادیئے ہیں۔ وہ ان کی تفصیلات میں نہیں جاتا۔ کیوں؟ اس لیے کہ یہ کام ہمارے سپرد کیا گیا ہے۔ اس سے ہماری ایک حد تک ' خود مختارانہ ' حیثیت کا ثبوت مہیا ہوتا ہے۔ قرآن میں کچھ معاشی اصول بھی بیان ہوئے ہیں اور کچھ سیاسی یا ملکی ضوابط بھی مگر قرآن کا اپنا کوئی معاشی یا سیاسی نظام نہیں ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ مسلمانوں کا سیاسی یا معاشی نظام کیا ہونا چاہیئے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن میں بیان کردہ عام اصولوں کی روشنی میں وقت اور حالات کے مطابق ہر زمانے اور ہر دور میں ہمیں اپنا معاشی اور سیاسی نظام خود تجویز و تعمیر کرنا چاہیئے اسلام قطعی جمہوریت ہے، نہ بادشاہت اور نہ آمریت۔ اسی طرح جدید اصطلاحی زبان میں وہ نہ سرمایہ دارانہ نظام ہے، نہ اشتمالی اور اشتراکی۔ بلکہ "اسلامی" نظام قرآنی احکام کی روح اور روحِ عصر کو تطبیق دینے سے تیار ہوتا یا ہوسکتا ہے۔ 'روحِ عصر' سے مراد زمانے اور وقت کا ہر اچھا بُرا رجحان نہیں۔ اس سے مراد وہ انسانی قدریں ہیں جو وقت کے ساتھ نسلِ آدم پر آشکار یا منکشف ہو رہی ہیں۔ مثال کے طور پر ایک زمانہ میں "غلامی" کا عام رواج تھا۔ اسلام نے بھی اس کی ایک ہلکی سی صورت گوارا کرلی مگر اب کسی مہذب سوسائٹی کا ضمیر اس کو برداشت نہیں کرسکتا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ یورپ اور امریکہ ہی میں نہیں عالمِ اسلام سے بھی غلامی کا دستور ناپید ہوچکا ہے۔ عورت کو سوسائٹی میں ایک پورے فرد کی حیثیت دینے کا خیال بھی 'روحِ عصر' کی ذیل میں آتا ہے۔ گزشتہ سو ڈیڑھ سو سال میں

جو انسانی قدریں قوت کے ساتھ ابھری ہیں، ان میں مزدور اور کسان سے ہمدردی، دولت
کو چند ہاتھوں میں جمع ہونے سے روکنے کا رجحان اور ہر ملک اور طبقے کا دوسروں کے معاشی
اور سیاسی استحصال سے محفوظ رہنے کا جذبہ بطورِ خاص اہم ہیں۔

قرآن حکیم انسانی زندگی کے لیے کامل نسخۂ ہدایت ہے۔ مگر اس معاملے میں اس نے نہایت بامعنی اور حکیمانہ سکوت اختیار کیا ہے کہ مسلمانوں کو کس طرح کا نظامِ مملکت ——— جمہوریت، بادشاہت یا آمریت ——— اختیار کرنا چاہیئے۔ آپ کہیں گے امرھم شوریٰ بینھم سے کیا جمہوری نظامِ سلطنت مراد نہیں تو میں کہوں گا کہ بادشاہت بھی تو شوریٰ پر مبنی ہو سکتی ہے اور آمریت بھی کچھ اس اصول کے قطعی منافی نہیں۔ مثال کے طور پر ایران کی بادشاہت اور مصر میں جمال عبدالناصر کی صدارت کو پیش کیا جا سکتا ہے کہ دونوں شوریٰ کے بغیر نہیں۔ لیکن فرض کیجئے میں یہاں آپ سے اتفاق کرتا ہوں تو سوال پیدا ہوگا کہ اسلامی جمہوریہ میں مشورہ یا رائے دینے کا حق کسے حاصل ہے؟ کیا علماء و فضلاء کو اور فقط ان لوگوں کو جنہیں امورِ سلطنت کا کچھ فہم و شعور حاصل ہو یا سلطنت کے ہر بالغ مرد و عورت کو؟ پھر کیا خلیفہ یا صدر کا انتخاب ایک مقررہ مدت کے لیے ہوگا یا ایک بار کا چنا ہوا صدر تا حینِ حیات اپنے منصبِ جلیلہ پر فائز رہے گا؟ کیا اسلامی جمہوریہ میں مختلف الخیال سیاسی جماعتیں اپنا وجود اور اپنی سرگرمیاں قائم رکھ سکتی ہیں یا نہیں؟ اگر سلطنت ایک سے زیادہ خطوں پر مشتمل ہو تو کیا وہ وحدانی طرزِ حکومت اختیار کریں گے یا وفاقی؟ قانون ساز ادارہ ایک ایوانی ہوگا یا دو ایوانی؟ اسلامی جمہوریہ میں صدارت اور وزارتِ عظمیٰ کے الگ الگ منصب ممکن ہیں یا نہیں؟ نظم و نسق کی باگ ڈور کابینہ اور اس کی وساطت سے مقننہ کے ہاتھ میں ہوگی یا سربراہِ مملکت کے ہاتھ میں؟ یہ اور اس قسم کے بیسیوں دوسرے اساسی سوالات ایسے ہیں کہ ان کے واضح تصور کے بغیر کسی جمہوریہ کے خط و خال نمایاں نہیں ہو سکتے اور اسے دیگر نظام ہائے سیاسی یعنی آمریت یا ملوکیت سے الگ نہیں کیا جا سکتا اور قرآن حکیم نے ان تمام امور میں حکیمانہ سکوت اختیار کیا ہے۔

اب ایک اور پہلو پر غور کیجئے۔ آپ جانتے ہیں کہ قرآن حکیم وضو کے بارے میں فقط اتنا کہہ دینے پر اکتفا نہیں کرتا کہ مسلمانو! نماز کے لیے کھڑے ہونے سے پہلے منہ دھو لیا کرو بلکہ کہنیوں تک ہاتھ اور ٹخنوں تک پاؤں دھونے کا حکم دیتا ہے۔ یہی نہیں وہ اور زیادہ تفصیلات میں جاتا ہے اور بتاتا ہے کہ اگر کسی مسلمان پر غسل واجب ہے اور اسے پانی نہیں ملتا، ادھر بارگاہِ الٰہی میں حاضر ہونے کا وقت قریب آ رہا ہے تو وہ کیا کرے۔ یہ بات بظاہر معمولی سی معلوم ہوتی ہے مگر قرآنِ حکیم ہمیں واضح طور سے بتاتا ہے کہ

ہیں پاک وصاف مٹی سے تیمم کرنا چاہیئے۔ پھر ایسا کیوں ہے کہ قرآن مجید یہ نہیں بتاتا کہ ہم جب اپنی مملکت قائم کریں تو رائے فقط پڑھے لکھوں کی پوچھیں یا سلطنت کے اندر بسنے والے ہر بالغ شخص کی۔

اقامت نماز کے لیے قرآن حکیم میں بار بار تاکید فرمائی گئی ہے۔ اسے نیکی کی راہ دکھانے والی اور برائیوں سے روکنے والی بتایا گیا ہے۔ اس کے ذریعے اللہ تعالیٰ سے مدد مانگنے کی صلاح دی گئی ہے۔ اسے وقت کی پابندی کے ساتھ ادا کرنے کو کہا گیا ہے۔ اس سے پہلے وضو یا تیمم کو ضروری قرار دیا ہے۔ اس کے ضائع کرنے والوں کو تنبیہ کی گئی ہے اور اس پر بھی اکتفا نہیں کیا گیا۔ عین حالت جنگ میں جب گھمسان کا رن پڑا ہو اور نماز کا وقت آجائے تو خدا کے نام پر لڑنے والے کس طرح فریضۂ نماز ادا کریں، قرآن حکیم اس کی بھی وضاحت کرتا ہے مگر اس معاملے میں وہ پھر خاموش ہے کہ اولوالامر کا مدت العمر کے لیے انتخاب کیا جائے یا ایک مقررہ میعاد کے لیے۔

روزہ فرض ٹھہراتے وقت یہ بتایا گیا ہے کہ یہ عبادت تم پر ہی نہیں تم سے پہلی امتوں پر بھی فرض تھی۔ پھر روزے کا حکم سنا کر اس کی حکمت وخیر کو بیان کیا گیا ہے۔ پھر انسان کی مختلف حالتوں میں اس کی فرضیت میں جو جو تبدیلی اللہ تعالیٰ کے نزدیک پسندیدہ ہے اس کی وضاحت کی گئی ہے۔ پھر سحری اور افطار کے اوقات نہایت واضح طریق سے بیان ہوئے ہیں مگر اس سوال پر کہ اسلامی مملکت میں صدر اور وزیر اعظم دو الگ الگ اشخاص ہوں کہ نہ ہوں، یا کابینہ ایوان نمائندگان کے سامنے جوابدہ ہو یا صدر مملکت کے سامنے قرآن حکیم کچھ نہیں کہتا۔

اسی طرح یہ صحیفۂ آسمانی نکاح وطلاق اور مہر وغیرہ کی کتنی ہی تفصیلات بیان کرتا ہے۔ وراثت میں ایک ایک حقدار کا حق اور حصہ مقرر کرتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ وہ بعض چھوٹی چھوٹی باتوں میں بڑے واضح اور قطعی احکام نافذ کرتا ہے۔ مثال کے طور پر اگر کوئی شخص غصے یا برافروختگی کے عالم میں بیوی کو ماں کہہ دے اور بعد میں اسے اپنی غلطی کا احساس ہو اور وہ معاملے کو رفع دفع کرنا چاہیئے تو قرآن حکیم اس کے لیے ایک خاص دستور مقرر کرتا ہے اور یہیں بتاتا ہے کہ ایسے شخص کو اوّل تو ایک غلام آزاد کرنا ہو گا۔ اگر وہ غلام نہیں رکھتا تو پھر اسے دو ماہ کے مسلسل روزے رکھنا ہوں گے تاکہ اسے اپنے جذبات پر قابو پانے کی تربیت، حاصل ہو اور اگر وہ روزے بھی نہ رکھ سکتا ہو تو پھر ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلائے (سورہ المجادلہ آیات: ۳-۴) لیکن قرآن حکیم اس امر کی کوئی وضاحت نہیں کرتا کہ اسلامی مملکت کے اندر ایک سے زیادہ سیاسی جماعتوں کا وجود ممکن ہے کہ نہیں ہے۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ نے ان اہم دستوری اور آئینی معاملات میں کیوں انسان کو واضح طور سے کوئی حکم نہیں دیا حالانکہ یہ معاملات وہ اہم سیاسی مسائل ہیں جن کو تسلی بخش طور سے حل کئے بغیر انسان کی اجتماعی زندگی کی گاڑی چند قدم بھی نہیں چل سکتی۔

دراصل وحی اور رسالت کی غرض وغائت انسان کے اندر ہستیٔ باری تعالیٰ کا شعور بیدار کر کے اس کے کردار میں خداشناسی اور خداترسی، حق پسندی اور حق گوئی، بے نفسی اور پاک بازی اور شجاعت و بلند حوصلگی کے جوہر پیدا کرنا ہے۔ اس مقصد کے لیے جو جو باتیں بنیاد اور اساس کی حیثیت رکھتی تھیں اور جن کا تعلق ہماری نفسی اور اخلاقی زندگی سے براہِ راست اور مستقلاً تھا ان میں سے ایک ایک کا قرآن حکیم نے ذکر کیا اور اس کے بارے میں ہماری واضح رہنمائی فرمائی ہے مگر جو باتیں اس مقصد و غایت کے لحاظ سے بنیادی اور اساسی نہ تھیں اور جن کے تقاضے اور مطالبے وقت کے ساتھ ساتھ بدلنے والے تھے، ان کو ہماری عقل و بصیرت اور فہم و فراست پر چھوڑ دیا کہ ہم انہیں اپنے طور پر طے کریں۔ یہی باعث ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نزولِ قرآن کے وقت ایسے لوگوں کی حوصلہ افزائی نہ کی جو ہر چھوٹے بڑے اور ادنیٰ و اعلیٰ مسئلے کو وحی کے ذریعے سے طے کرنے کرانے کے آرزومند تھے۔ اور قرآن حکیم نے صاف لفظوں میں ان کی اس روش کو ضرر رساں اور عاقبت نااندیشانہ قرار دیا۔ ارشاد ہوتا ہے: "مومنو! ایسی چیزوں کی بابت نہ پوچھو کہ اگر تم پر ظاہر کر دی جائیں تو تمہارے لیے باعث تکلیف ہوں اور ایسے وقت میں کہ قرآن نازل ہو رہا ہے، اگر تم ان کے متعلق سوال کرو گے تو تم پر ظاہر کر دی جائیں گی۔ اللہ تعالیٰ نے تمہاری پہلی پوچھ گچھ معاف کر دی ہے اور اللہ بہت بخشنے والا بردبار ہے۔ تم سے پہلے بھی ایک قوم نے ایسی باتیں پوچھیں، پھر وہ ان سے روگردان ہو گئے۔" (المائدہ۔ آیات: ۱۰۱-۱۰۲)۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ قرآن کریم ہر بات میں ہم کو قطعی حکم دینا پسند نہیں کرتا۔ وہ اصولی باتیں بیان کر دینے کے بعد ہماری عقل و دانش کی کارگزاریوں کے لیے زیادہ سے زیادہ وسیع میدان چھوڑ دیتا ہے کہ بصورت دیگر بدلتے ہوئے حالات سے نبرد آزما یا عہدہ برآ ہونا ہمارے لیے ناممکن ہو جاتا۔ ابوالکلام آزاد آیاتِ بالا کی تفسیر میں لکھتے ہیں: "فرمایا دینِ حق یہ نہیں چاہتا کہ انسانی معیشت کے لیے سختیاں اور جکڑ بندیاں پیدا کر دے اور تمہارے ہر عمل کو کسی نہ کسی پابندی سے ضرور ہی باندھ دے جو کچھ ضروری تھا بتلا دیا گیا جو چھوڑ دیا وہ صاف ہے، اب تم اپنے جی سے کاوشیں کر کے طرح طرح کے سوالات مت کرو، اگر کرو گے تو دین میں آسانی کی جگہ تنگی و مشقت پیدا ہو جائے گی۔" (ترجمان القرآن جلد اول صفحہ: ۴۳۳)

اس عہد میں بعض علمائے کرام نے اس خیال سے بے حد فائدہ اٹھانے کی کوشش کی ہے کہ اسلام پوری زندگی کے لیے ایک ضابطہ اور نظامِ حیات ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اسلام دین و دنیا کے امور میں اس طرح کی تفریق نہیں کرتا جس طرح بعض راہبانہ قسم کے مذہبی گروہ روا رکھتے ہیں مگر وہ امورِ زندگی کو من حیث المجموع دو حصوں میں ضرور بانٹ رہا ہے۔ میرے نزدیک آج کے حالات میں دین و دنیا کی یکجائی کے مقبولِ عام تصور کو جان لینے کی اتنی اہمیت نہیں جتنی اس حقیقت کو ذہن نشین کرنے کی ضرورت ہے کہ اسلام معاملاتِ انسانی میں ایک خاص طرح کی بانٹ یا تمیز روا رکھتا ہے۔ اور وہ بانٹ یا تمیز یہ ہے کہ دین و دنیا کے ایک معاملات تو وہ ہیں جن کو قرآن حکیم نے اپنا موضوع بنایا ہے جن کے حق و ناحق اور نیک و بد پر روشنی ڈالی ہے اور جن کی پرپیچ راہوں میں ہماری رہنمائی فرمائی ہے اور دوسری قسم کے معاملات و مسائل وہ ہیں جن کے بارے میں اس نے حکیمانہ سکوت برتا ہے اور خود ہم کو کرید کرید کر پوچھنے اور یوں اپنے آپ کو پابند بنانے سے منع فرمایا ہے۔

اس سے لامحالہ یہ نتیجہ نکلتا ہے اور خود آیاتِ بالا کا واضح منشا بھی یہی ہے کہ جو کچھ قرآن حکیم میں بیان ہو گیا اس کے تو ہم پابند ہیں اور مسلمان ہوتے ہوئے اس سے روگردانی نہیں کر سکتے مگر جو امور قرآن میں بیان نہیں ہوئے، دوسرے لفظوں میں جن کو اس نے بربنائے حکمت نظر انداز کیا ہے اور جو وقت کے ساتھ ساتھ پیدا ہو رہے ہیں تو ان کو طے کرنا ہمارا اپنا کام ہے۔ یہ معاملہ ہمارے اپنے فہم و تدبر کا ہے۔

معاملاتِ زندگی کے مابین اس اسلامی تفریق کو ایک اور انداز سے بھی ذہن نشین کیا جا سکتا ہے۔ غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ انسانی زندگی کے دو حصے ہیں۔ ایک حصہ وہ ہے جس کے تقاضے ہر حال اور ہر زمانے میں اپنی اصل پر قائم رہتے ہیں اور دوسرا حصہ وہ ہے جس کی ضروریات اور مقتضیات عہد بہ عہد اور نو بہ نو بدلتی رہتی ہیں۔ مثال کے طور پر جنسی آلودگی اور مال و دولت کی حریصانہ چاہت کو دیکھیے کہ ہر زمانے اور ہر عہد میں یہ انسان کی پاکیزہ خوشیوں اور حقیقی مسرتوں کے لیے سم قاتل رہی ہیں۔ نسلِ آدم خواہ کتنی ہی ترقی کر جائے اور علم و سائنس میں وہ کیسے ہی کمالات کر دکھائے اس کی روحانی اور اخلاقی زندگی کا جو تعلق جنسی آلودگی اور مال و دولت کی حریصانہ چاہت سے اول روز بندھ گیا ہے اس میں کوئی فرق نہیں آئے گا۔ قیامت تک کوئی زمانہ ایسا نہیں آئے گا جب یہ قباحتیں انسانی روح کو مریض اور ضعیف کرنے کی بجائے اس کی ترقی اور صحت کی ضامن بن جائیں۔ یہی حال خدا پرستی اور خدا جوئی کا ہے کہ آج سے ہزاروں سال پہلے جو اثر ان باتوں کا انسانی زندگی پر پڑتا تھا بعینہ وہی اثر آج بھی پیدا

ہوتا ہے اور ہزاروں سال بعد بھی ویسا ہی اثر پیدا ہوگا۔ اسی طرح ایک طرف جھوٹ، مکروفریب، فتنہ پردازی وعدہ خلافی اور بددیانتی کو دیکھئے اور دوسری طرف سچ بولنے، حق و انصاف کا ساتھ دینے، والدین اور عزیزو اقارب سے نیک سلوک کرنے، مصیبت میں کام آنے اور ازدواجی زندگی کو عدل و مروّت کی بنیاد پر استوار کرنے پر غور کیجئے۔ یہ مسائل اور معاملات ایسے ہیں کہ وقت کی تبدیلی کے ساتھ ان کی حقیقت و حیثیت میں کوئی فرق نہیں آتا۔ یہ امورِ انسانی زندگی میں ایک مستقل اور غیر متغیر جگہ رکھتے ہیں۔ اس کے برعکس ہماری معیشت کے کچھ پہلو ایسے ہیں جن کا یہ حال نہیں۔ جن کی کوئی مستقل حیثیت نہیں۔ جن کی افادیت اور عدم افادیت وقت اور حالات پر موقوف ہے۔ جن میں تغیر و تبدل ناگزیر ہے۔ جو آج ایک حالت پر ہیں تو کل دوسری پر۔ لباس، زبان، طرزِ رہائش، فنِ تعمیر، زراعت اور صنعت و حرفت، سائنسی اکتشافات اور نظامِ تعلیم یہ سب چیزیں ایسی ہیں جن کو ایک حال پر قرار نہیں۔ پہلا حصہ ہماری نفسی، اخلاقی اور منزلی زندگی کے ابدی مسائل و حقائق سے وابستہ ہے۔ دوسرا حصہ ہر دم متغیر اور ارتقاپذیر شعبہ ہائے تمدن پر مشتمل ہے۔ پہلا حصہ قرآن کا موضوع ہے اور دوسرا حصہ بربنائے حکمت ہمارے فہم و تدبّر پر چھوڑ دیا گیا ہے

اب سوال یہ ہے کہ طرزِ حکومت کس حصے سے تعلق رکھتی ہے۔ میرا خیال ہے تصریحاتِ بالا کے بعد اس سوال کے جواب میں چنداں دِقّت باقی نہیں رہتی۔ طرزِ حکومت بلاشبہ تغیر پذیر تمدن کا ایک شعبہ ہے اس کی سب سے بڑی دلیل تو یہی ہے کہ قرآن حکیم ان تمام سوالات کے بارے میں مسلمانانِ عالم کی بھلائی ہی کے لیے خاموش ہے جو میں نے مضمون کی ابتدا میں اٹھائے ہیں اور جو اس ضمن میں اٹھائے جا سکتے ہیں لیکن اس کے علاوہ بھی متعدد دلائل اس کے حق میں پیش کئے جا سکتے ہیں۔

آج ہر تعلیم یافتہ مسلمان اور قابلِ ذکر عالمِ دین ایمان کی حد تک اس بات پر یقین رکھتا ہے کہ قرآن جمہوری نظامِ حکومت کی تعلیم دیتا ہے اور ملوکیت کا سخت مخالف ہے۔ لیکن کیا ملوکیت وہی نظام نہیں جو صدیوں ہم میں رائج رہا ہے اور جس کے سائے میں بڑے بڑے ائمۂ دین، مجددین اور محدثین پروان چڑھے۔ بلکہ خود سلسلۂ سلاطین میں سے عمر بن عبدالعزیز، صلاح الدین ایوبی اور اورنگ زیب عالمگیر جیسے شہنشاہ بھی ہوئے ہیں جن کی زندگیاں دینداری اور پرہیزگاری کی عظیم مثالیں ہیں اور جن کے دم سے اسلام کو بڑا فروغ حاصل ہے۔

اس دلیل کے خلاف یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ یہ سب بزرگ انسان ہوتے ہوئے غلطی کر سکتے تھے اور اس بات کا امکان ہر وقت ہے کہ کوئی عالمِ دین یا بہت سے علمائے دین تھوڑے یا ایک لمبے عرصے کے لیے قرآن کے کسی پہلو کو سمجھنے میں ٹھوکر کھا جائیں۔ لیکن اس کا کیا جواب ہے کہ کسی زمانے میں خود پیغمبر

بادشاہ ہوئے ہیں ۔حضرت داؤدؑ جن کے کردار وایمان کی قرآن میں کئی جگہ تعریف ہوئی ہے نہ صرف خود بادشاہ تھے بلکہ خاندانی بادشاہت کے طرز پر ان کے بعد ان کے فرزند حضرت سلیمان وارث تخت و تاج بنے اور بڑے جاہ وجلال اور کروفر کے ساتھ انہوں نے حکمرانی کی۔ اس بادشاہت کو اللہ تعالیٰ نے باپ بیٹے پر اپنی خاص بخشش وعنایت قرار دیا ہے۔

اس کے علاوہ قرآن میں بیان کردہ ایک واقعہ سے بھی ملوکیت کے ادارہ کو براہِ راست تائیدِ نصرت خداوندی حاصل ہوئی ہے۔حضرت موسیٰ کے بعد جب بنی اسرائیل کے درمیان ایک نبی کی واجب التسلیم ذات بھی موجود تھی ،انہوں نے ایک بادشاہ کے تقرر کا سوال اٹھایا (تاکہ اس کی قیادت میں وہ دشمنوں کا مقابلہ کر سکیں) تو اللہ تعالیٰ نے طالوت کو ان کا بادشاہ مقرر کیا۔ اس کا اعلان کرتے ہوئے :

ان کے نبی نے ان سے کہا کہ اللہ نے تمہارے لیے طالوت کو بادشاہ مقرر کیا ہے۔ (البقرہ ۲۴۷)

اور جب حسبِ عادت بنی اسرائیل نے اس نامزدگی پر اپنی بے اطمینانی کا اظہار کیا تو نبیٔ وقت نے معاملے کی وضاحت یوں کی :

نبی نے کہا اللہ نے طالوت کو تم پر برگزیدہ کیا ہے ،علم وفہم میں اس کو برتری بخشی ہے اور اللہ اپنا ملک جس کو چاہتا ہے دیتا ہے۔ اور اللہ وسعتوں والا اور سب کچھ جاننے والا ہے۔ (البقرہ ۲۴۷)

اب ایک طرف داؤدؑ وسلیمان اور طالوت ہیں کہ بادشاہ ہونے پر برگزیدہ ٹھہرے اور دوسری طرف رسول کریمؐ کا اسوۂ حسنہ ہے۔ اس سے جمہوری اصولوں کی حمایت کا پہلو نکلتا ہے۔ آپ نے سب کچھ جانتے ہوئے بھی وفات سے قبل اپنے خاندان میں سے کسی کو اپنا جانشین نامزد نہ فرمایا کہ یہ اقدام آمرانہ یا ملوکانہ طرزِ عمل سے قریب تر ہوتا۔ پھر حضرت عیسیٰ جیسے جلیل القدر پیغمبر ہیں کہ خدا کے مقبول بندے اور رسول ہیں مگر نہ سلطنت کی نیو اٹھائی اور نہ طرزِ [illegible]ت پر توجہ کی۔

پیغمبرانِ الٰہی کے طرزِ عمل کے اس تفاوت پر غور کیجئے کہ کسی نے ملوکیت کو اپنایا، کسی نے جمہوریت کو ترجیح دی ، اور کوئی سرے سے سیاست و حکومت کے بکھیڑوں ہی میں نہ پڑا۔ اب بتایئے کہ اس سے کیا بات ثابت ہوتی ہے ؟ کیا اس سے نہایت محکم اور قطعی صورت میں یہ ثابت نہیں ہوتا کہ طرزِ حکومت کے مسائل اصل دین ـــــ زندگی کے غیر متبدل حقائق ـــــ سے کچھ تعلق نہیں رکھتے۔کیونکہ دین کی اصل میں پیغمبرانِ الٰہی کے فکر وعمل کا اختلاف سلسلۂ رسالت اور روحِ نبوت ہی کی نفی ہے۔

اوپر جو کچھ بیان ہوا ہے اسے یوں بھی ادا کیا جا سکتا ہے کہ خود اسلام میں دین اور مملکت الگ الگ ہیں۔ لیکن یہ بیان جس قدر چونکا دینے والا ہے اسی قدر وضاحت طلب بھی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جس مخصوص انداز سے آج بعض علمائے کرام دین اور مملکت کو اکٹھا کر رہے ہیں اور آئین و دستور کی ایک ایک دفعہ کو کتاب و سنّت سے نکالنے کی کوشش میں مصروف ہیں اور ملکی سیاست کو اپنے فکر کا پابند بنانا چاہتے ہیں اسلام کی روح اس کے منافی ہے۔ جب خود قرآن حکیم کا نازل کرنے والا ہمیں ان امور میں پابند بنانا نہیں چاہتا اور وہ طرز حکومت اور آئین و دستور وغیرہ کے بارے میں ایک حکیمانہ سکوت پسند کرتا ہے تو پھر انسانوں کی یہ جسارت کس قدر دیدہ دلیری ہے کہ جن مسائل کا ذکر وہ کتاب و سنّت میں نہیں پاتے ان کو بزعم خود "کتاب و سنت کی روشنی میں" حل کر کے اپنے اجتہادات کو عین اسلام ظاہر کرتے ہیں اور جب ان سے اختلاف کیا جاتا ہے تو اسے کفر و اسلام اور حق و باطل کی جنگ قرار دیتے ہیں۔ گویا جن معنوں میں آج عالم اسلام کی مذہبی تحریکیں دین و سیاست کو غیر منفک دیکھتی ہیں۔ ان معنوں میں وہ از روئے قرآن غیر منفک نہیں ہیں بلکہ ایسا خیال کرنا اور اس کو صحیح تسلیم کرنا اسلامی ممالک کے سیاسی اور معاشی مسائل کے حل میں بے شمار رکاوٹیں پیدا کر سکتا ہے اور جن لوگوں کی نظر گہری ہے وہ جانتے ہیں کہ یہ تحریکیں اپنی انتہا پسندی اور نظریاتی تشدد کے باعث ہر جگہ ترقی کی راہ میں حائل ہو رہی ہیں۔

لیکن ایک اعتبار سے اسلام میں سیاست دین کی پابند ہے۔ دین مختصراً دو چیزوں کا مجموعہ ہے اوّل کائنات اور انسانی زندگی کے آغاز و انجام کا ایک نظریہ۔ دوم ضابطۂ اخلاق و عمل۔ ان دونوں کے قبول کرنے یعنی نظریئے پر یقین رکھنے اور ضابطۂ اخلاق پر عمل کرنے سے ہمارے اندر وہ سیرت پیدا ہوتی ہے جو مقصود وحی اور غائت رسالت ہے۔ قرآن نے جو ضابطۂ اخلاق دیا ہے انفرادی زندگی میں اس کی روح پاکبازی اور تقویٰ ہے۔ اور اجتماعی زندگی میں اس کی روح عدل و انصاف ہے۔ اسلام میں سیاست ان معنوں میں دین کی پابند ہے کہ اسے عدل و انصاف کا پابند ہونا چاہیئے۔ اور حالات کی تبدیلی کے ساتھ عدل و انصاف جن سیاسی معاشرتی اور معاشی تبدیلیوں کا تقاضا کرے ان کو اسے اختیار کرنا چاہیئے۔ اقبال کے جس مصرعے سے بعض حلقوں نے جی بھر کر فائدہ اٹھایا ہے اور جس میں انہوں نے دین سے سیاست کی جدائی کو چنگیزی قرار دیا ہے اس کا مطلب بھی دراصل یہی ہے کہ ریاست اور سیاست حق و انصاف کی پابند ہو ورنہ اقبال نے خود ایک مقام پر اس حیثیت کا اعتراف کیا ہے کہ اسلام کے نظام تمدن میں مذہب اور سیاست کو الگ رکھنے کی وسعت موجود ہے۔ اپنے

خطبات میں وہ ترکی کی آئینی تبدیلیوں سے بحث کرتے ہوئے کہتے ہیں :

" کچھ عرصہ پہلے ترکی میں دو طبقۂ خیال پائے جاتے تھے۔ ایک کی نمائندگی نیشنلسٹ پارٹی اور دوسرے کی نمائندگی اصلاحِ مذہبی کی علمبردار جماعت کرتی ہے۔ نیشنلسٹ پارٹی کی اصل دلچسپی مذہب میں نہیں بلکہ مملکت میں ہے۔ ان مفکرین کے نزدیک مذہب بطورِ خود کسی آزاد حیثیت کا مالک نہیں۔ قومی زندگی میں اصل چیز مملکت ہے۔ جس سے باقی امور کی حیثیت اور نوعیت طے پاتی ہے لہٰذا وہ مذہب اور مملکت کی باہمی وابستگی کے پرانے تصورات کو رد کرکے چرچ اور 'سٹیٹ' کی علاحدگی پر زور دیتے ہیں۔ اب بطورِ مذہبی سیاسی نظام کے اسلام کی ہیئت ایسی ہے کہ وہ بلاشبہ اس قسم کے نظریئے کی اجازت دیتا ہے۔ اگرچہ میری ذاتی رائے میں ایسا خیال کرنا غلط ہے کہ اسلام مملکت کے سوال کو اپنے نظام کے بقیہ امور پر حاوی سمجھتا ہے۔" (خطبات مطبوعہ لاہور ۱۹۳۰م)

اپنے ایک خط میں بھی وہ ترکی کی آئینی حیثیت کا ذکر کرتے ہوئے بعض جذباتی علماء کی طرح کوئی فتویٰ صادر نہیں کرتے اور اس بات کو امکان سے باہر نہیں سمجھتے کہ مذہب اور مملکت کی یہ علاحدگی عالمِ اسلامی کے لیے باعثِ برکت ثابت ہوسکتے ہیں:

" ترکوں نے جو مذہب اور مملکت میں امتیاز کرکے ان کو الگ الگ کر دیا ہے، اس کے نتائج نہایت دور رس ہیں اور کوئی نہیں کہہ سکتا کہ یہ افتراق اقوامِ اسلامیہ کے لیے باعثِ برکت ہوگا یا شقاوت۔" (اقبالنامہ حصہ اول۔ صفحہ ۴۹)۔ اس سے مقصود یہ دکھانا تھا کہ اقبالؔ جو اس عہد میں اسلامی قدروں کا سب سے بڑا مجدّد ہوا ہے اور جس کے فکر میں مذہب و سیاست کی باہمی وابستگی کا خیال بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ ایک مفکر اور مدبّر کی حیثیت سے ترکی کے طرزِ عمل کو خلافِ اسلام قرار نہیں دیتا بلکہ مذہب و سیاست کی دوئی کے نظریئے کی اسلام کے اندر گنجائش پاتا ہے۔

یہ موضوع بڑی تفصیلی بحث چاہتا ہے اور ابھی بے شمار پہلوؤں پر روشنی ڈالنے کی ضرورت ہے مگر اس مختصر اور ابتدائی مضمون سے اتنی بات تو ضرور واضح ہوگئی ہوگی کہ دین و سیاست کے باہمی تعلق کے ضمن میں بعض حلقوں کی طرف سے جس نظریاتی تشدد اور اکڑپن کا مظاہرہ کیا جاتا ہے اسلام میں اس سے کہیں زیادہ حکیمانہ وسعت اور فراخی پائی جاتی ہے۔